اقبال کے بنیادی افکار و نظریات: عہد حاضر کے تناظر میں

(Basic Thoughts and Philosophies of Iqbal in the Perspective of the Contemporaneous Era)

Dr .Muhammad Shoukat Ali

Assistant Professor, Lahore Leads University, Lahore.

Abstract:

Allama Iqbal wanted to recuperate the true soul of democracy. According to him, democracy is about reciprocated respect, independence, respect, peacetime and faith and self-determination of the members of the society. It consists of civilization, traditions, culture and philosophies. On the contrary, Iqbal is against western democracy because it has the spirit of free enterprise in it and the flaws and evils of capitalism are found in western equality. This system kills the spirit of brotherhood and organization. And human behavior is violated. Powerful services try to make weak nations their slaves, which creates a state of distrust in the society. Through productiveness and trade, civilization is also weakened and oppression and subjugation. A state-owned of oppression is produced.

Key words: Allama Iqbal, civilization, traditions, culture, brotherhood, capitalism, oppression

علامہ اقبال کے نظریات و تصورات میں تصور جمہوریت، تصوف، خودی اور اجتہاد کا تصور بہت ممتاز نوعیت کے حامل ہیں۔ یہاں ان تمام تصورات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے جس سے فکر اقبال سے آگہی کا ایک منفرد مقام و مرتبے کا تعین کرنا مقصود ہے۔ تصور جمہوریت میں اقبال روحانی اور مذہبی اقدار کے ترجمان ہیں۔ وہ جہاں مذہبی اقدار و روایات کے علم بردار ہیں وہاں عصر حاضر کے تقاضوں کو بھی ساتھ لے کر چلنے کا درس دیتے ہیں۔ وہ جمہوریت میں دھوکہ، ہوس، لالچ اور منافقت کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک جمہوریت سے قائم حکومت عملاً عوام کے لیے فلاح و بہبود کے کام کرے۔ فرد کی روحانی آزادی ہو اور معاشرے کو روحانی بنیادوں پر کاربند کیا جائے جس سے کائنات کی روحانیت کی تعمیر ہو سکے۔ اقبال اسلامی جمہوریت اور شورائی نظام فلاحی مملکت کی تشکیل کرتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی جمہوریت میں اقبال کے تصور کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اقبال جمہوریت کو اخلاقی قدروں کا پابند رکھنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے جمہوری اداروں کی صحیح خطوط پر نشوونما کے قائل ہیں۔ اس نشوونما کے لیے عوام کی ذہنی تربیت بھی ضروری ہے اور مذہب کا عمل دخل بھی۔ اس لیے اقبال نے اپنے تصور کو خطبات میں روحانی جمہوریت کے نام سے بیان کیا ہے۔ ان کی رائے میں جمہوری قدریں معاشرتی سطح پر پھل پھول نہیں سکیں اور مسلمانوں کو اب آنکھیں کھولنی چاہیے۔“ (۱)

اقبال جمہوریت میں اسلامی نظام کے قول و فعل، رموز و اوقاف اور اقدار و روایات کے قائل ہیں۔ جو نظام اسلام نے پیش کیا ہے اس کو اصل معنوں میں قائم کرنے کے خواہاں ہیں۔ اسلامی جمہوری نظام عام لوگوں کے حقوق کی پاسداری کا علم بردار اور جمہور کے پوری طرح سے تحفظ کا ضامن

ہے۔ مغربی نظام حکومت میں اقتدار اور حاکمیت کو انسانوں سے منسوب کیا جاتا ہے جب کہ اسلامی طرز حکومت میں اقتدار و حاکمیت کا مالک اللہ تعالیٰ کو سمجھا جاتا ہے۔ اسلامی نظام سیاست میں توحید کو اولیت حاصل ہے اور اس کی اطاعت ہی لازم و ملزوم ہے۔ وہ ذات اللہ پاک کی جس کی پیروی و اطاعت ہر چیز سے بڑھ کر ہے۔ اسلام میں قرآن کے نظام کو برتری حاصل ہے اور دنیا و آخرت کی فلاح اس میں مرکوز ہے۔ اسلامی نظام میں بڑائی علم، عمل اور تقویٰ کو حاصل ہے۔ اس کے برعکس مغربی جمہوریت میں دولت کو اعلیٰ سمجھا جاتا ہے۔ مسلمان حکمران کو آمریت سے دور رکھا جاتا ہے اس کے خلاف کوئی بھی مسلمان اعتراض کر سکتا ہے۔ اسلامی حکومت شریعت کی مرہون منت ہے اور اس کا اصل مقصد فلاح و بہبود ہے۔ اسلامی نظام میں شریعت اور حکومت ہم آہنگ ہیں۔ اسلامی تمدن مستقل اور پختگی کی علامت ہے اور مغربی تہذیب و تمدن غیر معیاری اور غیر مستقل ہیں۔ اسلامی حکومت میں مسلم اور غیر مسلم کو برابر حقوق دیے جاتے اور رعایا کو مناسب بنیادی حق حاصل ہوتا ہے۔ آج کے دور میں مسلم جمہوری نظام کی اشد ضرورت ہے جس پر اقبال نے بہت زور دیا۔

اسلامی نظام حکومت میں منتخب خلیفہ کو اسلامی اصول و ضوابط سے آگاہ ہونا چاہیے۔ اس کا انتخاب ساری قوم کے اتفاق رائے سے ہوتا ہے۔ اس کا صادق اور امین ہونا ضروری ہوتا ہے اور حکومت امانت کے طور پر اس کے سپرد کی جاتی ہے۔ خلیفہ شوریٰ کے مشورے سے حکومت کی باگ دوڑ کو قائم رکھتا ہے اور سب سے بڑھ کر اللہ کا خوف اس کے دل میں ہوتا ہے۔ خوف خدا سے اس کے اندر کینہ پروری اور مالی فائدہ کی لت نہیں پڑتی بل کہ عوام کی فلاح و بہبود کی ترویج ہوتی ہے۔ دور حاضر میں جمہوریت ایک دھوکہ بازی اور لالچ کی ایک عظیم داستان ہے جس میں اقتدار میں آنے والے خوب عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں اور عوام کے پیسوں کو اپنی ملکیت سمجھتے ہوئے چوری کرتے ہیں۔ جمہوری طرز عمل کی وضاحت میں شیخ عمر فاروق لکھتے ہیں:

”الیکشن جسے جمہوری طرز عمل کی روح قرار دیا گیا سرے سے دھوکہ اور فراڈ ہے۔ لالچی اور مال دار لوگ اس میں حصہ لیتے ہیں اور دھن دولت کی بنیاد پر وہ اقتدار حاصل کرتے ہیں جس میں لاکھوں اور اربوں روپیہ پبلسٹی پر ضائع ہو جاتا ہے۔ اقتدار ملنے پر خزانہ عامرہ کا بے دریغ استعمال شروع ہو جاتا ہے۔ اپنے اور اپنی پارٹی کے گھر بار کو بھرا جاتا ہے۔ غریب عوام پر ٹیکسوں کا بوجھ بڑا کر خزانے کی کمی کو پورا کیا جاتا ہے۔“ (۲)

علامہ اقبال جمہوریت کی حقیقی روح کو زندہ کرنے کے خواہاں تھے۔ ان کے نزدیک جمہوریت معاشرے کے افراد کے باہمی عزت، خوداری، احترام، امن و ایمان اور آزادی کی پاسدار ہوتی ہے۔ اس میں تہذیب و تمدن، روایات، ثقافت اور عقائد کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس اقبال مغربی جمہوریت کے خلاف ہیں کیوں کہ اس میں سرمایہ داری کی روح مزین ہے اور مغربی جمہوریت سرمایہ داری کی خامیاں اور برائیاں پائی جاتی ہیں۔ اس نظام سے اخوت اور بھائی چارے کی روح فوت ہو جاتی ہے اور انسانی رویوں کی پامالی کی جاتی ہے۔ طاقت ور قوتیں کمزور قوموں کو اپنا غلام بنانے کی کوشش کرتی ہیں جس سے معاشرے میں عدم اعتماد کی کیفیت جنم لیتی ہے۔ صنعت و تجارت کے ذریعے تہذیب و تمدن کو بھی کمزور کیا جاتا ہے اور ظلم و ستم کی کیفیت

پیدا کی جاتی ہے۔ مغربی جمہوریت نے دنیا میں عدل انصاف کی جگہ فتنہ و فساد اور بربریت کی ترویج کی ہے۔ اقبال اپنے اشعار میں مغربی جمہوریت کو کھل کر بیان کرتے ہیں:

وہ حکمت ناز تھا جس پر خرد مندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجہء خونیں میں تیغِ کار زاری ہے
تدبّر کو فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدّن کی بنا سرمایہ داری ہے (۳)

اقبال کے نزدیک مغربی جمہوری نظام میں صرف وہی لوگ عہدہ کے حق دار ٹھہرتے ہیں جو مال دار اور سرمایہ دار ہوتے ہیں۔ وہ الیکشن میں کامیابی کے لیے پیسے کا بے دریغ استعمال کرتے ہیں اور بے ضمیر لوگوں سے ووٹ خریدتے ہیں۔ مادہ پرست لوگ ہی مغربی جمہوری حکومت کی کرسی کے حقدار ہوتے ہیں۔ مغربی جمہوریت میں مذہبی اور اخلاقی قدروں کو پامال کیا جاتا ہے جب کہ اقبال اس طرح کی جمہوریت کے قائل نہیں ہیں جس میں انسانی فلاح و بہود کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ مغربی جمہوریت میں شماریات کے حساب کو اولیت دی جاتی ہے جب کہ وزن کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اقبال فرد فرنگی اور طرز جمہوریت کو اپنے اشعار میں پیش کرتی ہیں:

اس راز کو اک مرد فرنگی نے کیا فاش
ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے
جمہوریت اک طرز حکومت ہے جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے! (۴)

اقبال نے جمہوری نظام حکومت کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور اس کی اصلیت کو خوب اجاگر کیا ہے۔ وہ جمہوریت کے مخالف نہیں تھے بلکہ حقیقی جمہوریت کے طرف دار ہیں۔ مغربی جمہوریت کے ڈانڈے ملوکیت ملتے ہیں اور ملوکیت میں افراد کے ذاتی اغراض کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ اس میں جبر و تشدد کے ذریعے مخالفین کو دبایا جاتا ہے۔ عوام کو دھوکا دے کر ہر وقت اثاثوں کو بڑھانے کی ترویج کی جاتی ہے۔ اقبال کے خیال میں مغربی جمہوریت میں ملوکیت کا نظام پنہاں ہے۔ اس بات کی وضاحت اقبال کی طویل نظم ”سلطنت“ اور ”ابلیس کی مجلس شوریٰ“ میں ہوتی ہے۔ اس ضمن میں اقبال کے اشعار دیکھیے:

ہے وہی ساز کہنِ مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری (۵)
خیر ہے سلطانی جمہور کا غوغا کہ شر
تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے باخبر (۶)
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر! (۷)

اقبال کی ذہنی کیفیات کو جاننے کے لیے ان کا نظریہء تصوف سے آگاہی بھی ضروری امر ہے۔ تصوف کی بنیاد قرب الہی اور اللہ کی ذات میں گم ہونے پر منحصر ہے۔ اس نظریے میں حقیقت

کے ادراک کے لیے وجدانی کیفیت سے گزرا جاتا ہے۔ اس میں انسان کے ظاہری حواس کے ساتھ ساتھ باطنی حواس بھی کار فرما ہوتے ہیں۔ اقبال کے ہاں تصوف سے لگاؤ ان کی واٹنی دین ہے۔ صوفیوں سے محبت کا پہلو آخری دم تک کار فرما رہا۔ انہوں نے اپنی نظم و نثر میں قرآن و حدیث سے بالاتر تصوف کی مخالفت کی ہے۔ جبر و انفعالییت سے مزین اور رہبانیت کا مرتکب تصوف اقبال کی نظر میں غیر فعال ہے۔ غار نشینی اور صحرانوردی تصوف کا خاصہ نہیں ہے بلکہ اس طرح زندگی سے گریز کی کار فرمائی ہوتی ہے۔ دل کا بنجر ہونا عشق کا وصف نہیں ہو سکتا۔ اللہ کی چاہت میں تمام کائنات سے محبت شامل ہے اور انسان کی خودی کی پرورش اسی میں پنہاں ہے۔ اسلامی تصوف میں مسلمانوں کے زوال اور احیائے اسلام کی ترویج کے لوازمات کی نشان دہی بھی ضروری ہے۔ اس سے انسانوں میں حقیقی بصیرت کا درس بھی واضح ہوتا ہے اور انسانوں کی محبت میں اللہ کے عشق کی جھلک نمایاں ہوتی ہے۔ اقبال کے تصورات میں تصوف کی تعلیم خودی کا استحکام ہے جب کہ روایتی صوفیائے کرام میں یہ امر کمزور ہے۔ جس تصوف کی بنیاد میں توحید سے زیادہ الحاد کی کیفیت ہو، وہ اس قسم کے تصوف کے قائل نہیں ہیں۔ وہ رومی اور مجدد الف ثانی کے تصوف کے حامی ہیں کیوں کہ ان کا تصوف اسلامی شریعت سے مربوط ہے۔ حق بینی اور عشق آفرینی انسانی زندگی میں انقلاب کا باعث ہے۔ انسانی زندگی کی بنیادی قوتوں کو پروان چڑھانے کے لیے قرآنی نظریہ حیات پیروی بہت اہم ہے۔ عشق حقیقی خلوت نہیں ہے بلکہ جلوت میں موجود ہے۔ قرآن پاک میں دنیا و آخرت کی اصلاح کا سامان موجود ہے اور اس کی تکمیل پختہ ایمان اور عمل سے ہوتی ہے۔ صوفیائے کرام سے عقیدت اور اقبال کی خودی کے ضمن میں پروفیسر محمد فرمان لکھتے ہیں:

”علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ مرحوم نے خودی کا درس دیتے ہوئے انسانی خودی کی تکمیل کے لیے ضبطِ نفس اور اطاعت پر زور دیا ہے۔ اسلامی تاریخ میں صوفیہ کرام کی زندگیاں ضبطِ نفس اور اطاعت شعاری کا کامل نمونہ پیش کرتی ہیں۔ علامہ مرحوم نے ان بزرگواروں کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کیا ہے اور جن لوگوں نے روحانیت کو غیر اسلامی رنگ میں پیش کیا ہے، ان سے بیزاری کا اظہار کیا ہے۔“ (۸)

اقبال مسلمانوں کو تصوف کے ذریعے آدمیت، انسانیت اور حرکت و عمل کی ترغیب دیتے ہیں۔ وہ ترکِ دنیا کی بجائے دنیوی معاملات کو حل کرنے کا درس دیتے ہیں۔ وہ تصوف سے پیار و محبت، دوستی، بھائی چارے، فلاح و بہبود، انسانیت کی ترویج اور امن و امان کا سبق دیتے ہیں۔ ایسا تصوف جس میں رہبانیت اور الحاد کی کار فرمائی ہو اور خودی کو ضعیف کرنے کا سامان ہو، وہ کبھی بھی تصوف کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ صوفیانہ واردات کو نفسیاتی طور پر سائنسی انداز میں پرکھنا چاہیے۔ قرآن میں بھی ”عالم تاریخ“ اور ”عالم فطرت“ کے تجزیہ پر زور دیا گیا ہے۔ قرآن پاک کے مطالعہ سے دن اور رات کے تبدیل ہونے، چاند اور سورج کی حرکات میں مسلمانوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ مسلمانوں کو رُتار پوشی کو اپنے دلوں سے نکال دینا چاہیے اور توحید کی اہمیت کو اجاگر کرنا چاہیے۔ تہذیب و تمدن میں اسلامی روایات اور شریعت اسلام کی صحیح معنویت قرآن پاک میں مزین ہے اور یہی تصوف کی درست روح ہے۔ امت کو غیر ضروری روایات کو چھوڑ کر اسلامی تعلیمات کی پاسداری کرنی چاہیے۔ اُن خرافات سے دور رہنا چاہیے جن میں عجم گم ہے اور توحید پر ایمان رکھنے کی بجائے بتوں کی پجاری بنی ہوئی ہے۔ اس ضمن میں اقبال کے اشعار دیکھیے:

مسلمان مگر تمدن، کلام
 ہے دل ابھی تک تصوف،
 توحید میں ہے شریعت،
 گرم زُنار پوش
 جوش

بُنان عجم کے پُجاری تمام!
 حقیقت خرافات میں گئی
 یہ اُمت روایات میں گئی (۹)

اقبال کے تصوف کے ضمن میں ”ساقی نامہ“، ”ہندی اسلام“، ”زُہد اور رندی“ اور ”ابلیس کی مجلس شوریٰ“ جیسی نظمیں اہم ہیں۔ ان نظموں میں اقبال کے افکار و نظریات میں تصوف کی خوب وضاحت ہوتی ہے اور تصوف کی معنویت واضح ہوتی ہے۔ علامہ اقبال ایک بلند اقدار کے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ عظیم فلسفی اور قومی روایات کے علم بردار ہیں۔ ان کے نظریہ تصوف کی اصل بنیاد نظریہ خودی پر ہے۔ ان کی شعری عظمت اور عملی زندگی کے مطالعہ سے فقر کی جھلک نمایاں ہوتی ہے۔ اسلامی فکریات میں ”فقر“ نظریہ خودی کو ترغیب دیتا ہے۔ ”اسرار خودی“ اقبال کی ایک اہم تصنیف ہے جس میں سب سے پہلے ”نظریہ خودی“ کو پروان چڑھایا گیا۔ ان کی شاعری میں نظریہ خودی اسلامی تصور کا ترجمان ہے۔ انہوں نے اپنے نظریہ خودی سے مسلم امہ کو بیدار کیا اور ان کی عظمت اور وقار کا شعور دیا۔ اقبال نے جہاں اپنے نظریات و تصورات میں مسلم قوم کو آگہی و شعور کا پیغام دیا ہے وہاں انسانیت کی بھلائی، عروج، سرفرازی اور بلند خیالی کا بھی درس فرمایا ہے۔

اقبال خواب غفلت میں ڈوبے مسلمانوں کو عرفان ذات کا درس دیا۔ ان کے کلام میں خودی کا مطلب انا، غرور اور خود پسندی ہرگز نہیں ہے بلکہ وہ انسان کو اپنی خودی میں ڈوب کر سراغ زندگی کو پالینے کی ترغیب دیتے ہیں۔ خودی فرد کی ترقی، تربیت اور انسانی زندگی کی حقیقت کو اجاگر کرتی ہے۔ خودی سے انسان کی آزادی، راز حیات، عزت نفس، شخصیت اور اپنی پہچان کا ادراک ہوتا ہے۔ اس سے پستی اور غلامی کی زنجیریں ٹوٹ جاتی ہیں اور برے عقائد و بوسیدہ روایات سے چھٹکارہ ممکن ہے۔ قومیں اس وقت زوال کا شکار ہوتی ہیں جب اپنی خودی کو بھلا دیتی ہیں۔ انسان اس دنیا میں اشرف المخلوقات ہے اور ساری کائنات کو اس کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان اپنے اندر موجود صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور اپنی خودی کو درست سمت میں استعمال کرے۔ اقبال انسان کی سچی سوچ اور اس کے عمل کو درست معنوں میں پیش کرتے ہیں اور جس طرح کے اس کے اعمال ہوں گے ویسی ہی اس کی ترقی اور تنزلی کا معیار قائم کیا جائے گا۔ خودی کا معیار اللہ تعالیٰ کی خوشنودی میں مزین ہے اور خودی کی اصل روح روحانی ہے۔ اس ضمن میں اقبال فرماتے ہیں:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
 خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تری رضا کیا ہے (۱۰)
 عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی، جہنم بھی
 یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ ٹوری ہے نہ ناری ہے (۱۱)

خود کا لفظ فارسی زبان سے ماخوذ ہے اور لغت میں اس کے دو معنی لیے جاتے ہیں۔ خود کے ایک معنی شعور اور دوسرے تکبر یا غرور کے ہیں۔ خودی کے نظریہ میں ”خود کے شعور“ کو ممتاز سمجھا جاتا ہے اور دوسرے معنی ”تکبر اور غرور“ کو رد کر دیا گیا ہے۔ اقبال تکبر اور غرور کی بجائے خودی کو اپنی ذات اور کائنات میں دوسروں کے احساس اور اجتماعی خودی کے تصور کو پیش کرتے ہیں۔ صدیوں سے ہمارے صوفیا میں ”خود کا شعور“ ابھرا ہے جس میں وہ خود کو مٹا کر رب کی پہچان کرتے ہیں۔ صوفیوں کے نزدیک خود کو مٹانا زندگی کی راحت ہے اور خدا کو پا لینے کا بہترین ذریعہ ہے۔ ان کے یہاں ”من عرف نفسه، فقد عرف ربه“ جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا“ بہت اہم ہے۔ اقبال خودی کو ذات تک محدود نہیں کرتے بلکہ لا محدود کے خواہاں ہیں۔ ان کا یقین نفی خودی پر نہیں ہے بلکہ اثباتِ خودی پر ہے۔ وہ خودی کو وحدت وجدانی یا شعور کا روشن محرک تصور کرتے ہیں جس سے زندگی کو ”پیہم روان“ رکھنے والی طاقت میسر ہوتی ہے، عالم اسباب و علل کی منتشری اور پراگندہ رجحانات کی شیرازہ بندی ہوتی ہے۔ اقبال کے نظریہ خودی کے ضمن میں علی ظہیر منہاس لکھتے ہیں:

”اس میں کوئی شک نہیں کہ نظریہ خودی کو اقبال کی فلسفیانہ شاعری میں مرکزیت حاصل ہے۔ اقبال کی ہر نہج اسی محور کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ خودی عظمت آدم کی شناخت کا نام ہے۔ خودی خود حیات ہے۔ خودی عشق کے مترادف ہے۔ خودی جذبہ تسخیر کا نام ہے۔ خودی حقیقت میں خود آگاہی کا حاصل ہے۔ خودی تفسیر روح سے موسوم ہے۔ خودی تجلیات قلبی ہے۔ خودی سر چشمہ جدت و ندرت ہے۔ خودی یقین کی گہرائی ہے۔ خودی خلش عشق ہے۔ خودی سوز حیات کا پرتو ہے۔ خودی ذوق تخلیق کی دریافت ہے۔ خودی تخلیق مقاصد سے عبارت ہے۔ خودی حرکت و حرارت سے مملو ہے۔ خودی زماں و مکاں پر تصرف کا ماہصل ہے۔“ (۱۲)

اقبال کے نظریات و تصورات میں ”نظریہ خودی“ بہت افضل ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں خودی کی تبلیغ و ترویج کو پروان چڑھایا ہے۔ انسان کی خودی جب جاگ اٹھتی ہے تب اس کی منزل مقصود تک رسائی سہل ہو جاتی ہے۔ جس نے اپنی خودی کو پہچان لیا، اُس کے لیے دنیا کی ہر چیز عارضی اور غیر معمولی نوعیت کی ہو جاتی ہے۔ وہ کسی بھی صورت اپنی خودی کا سودا نہیں کرتا، حالات کیسے ہی ناساز کیوں نہ ہو وہ اس میں مطمئن رہتا ہے۔ اس ضمن میں اقبال فرماتے ہیں:

مرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے
خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر! (۱۳)
خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تُو آبِ جو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں (۱۴)

اقبال کی عملی زندگی میں حالات و واقعات سے بھی خودی اور فقر کی توضیح و تشریح ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں حق گوئی اور راست بازی کو اپنایا اور بڑی حکمتِ عملی سے پیغامِ عمل کو عوام الناس کے سامنے کر کے دکھایا۔ ہر انسان کی زندگی میں حالات میں تغیر و تبدل پیدا ہوتا ہے اور اقبال نے بھی زندگی میں نشیب و فراز کا سامنا کیا، لیکن خودی کا دامن ہمیشہ برقرار

رکھا۔ اقبال کا شمار دنیا کے عظیم شعرا میں ہوتا ہے کیوں کہ ان کی شاعری کا مقام اعلیٰ، خاص آہنگ و رنگ اور خاص نظریہ پر منقسم ہے۔ ان کی شاعری میں فرضی حسن و عشق کی بجائے مقصدیت پر انحصار کیا جاتا ہے۔ شمع و پروانہ، گل و بلبل، قمری و سرو، شریں و فریاد جیسے مضامین کو ایک واضح نصب العین کے مطابق پیش کیا ہے۔ انسان کے اخلاقی اور مذہبی نصب العین کا اثبات بھی خودی میں مزین ہے۔ نظریہ خودی سے نیکی و بدی کے معامہ کو حل کیا جاسکتا ہے۔ ہر وہ شے جس سے خودی کو استحکام حاصل ہو وہ خیر ہے اور جو کمزور و لاغر کرے وہ شر ہے۔ اقبال نے اپنی تصانیف ”اسرارو خودی“ اور ”رموزِ بے خودی“ میں استحکام خودی اور اجتماعی مقصدیت کو فروغ دیا ہے۔ خودی میں تین منزلیں اتباع شریعت، ضبط نفس اور نیابت الہی اہم ہیں۔ خودی سے اللہ پر ایمان میں مضبوطی اور پختگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ عمل عقل سے ماورا ہو کر عشق کی بلندیوں کو چھو جاتا ہے۔ شاعر مشرق نے خودی کی ترویج کے لیے بہادری اور جرأت کو بھی لازمی قرار دیا ہے۔ انسان خودی سے خوف، ڈر، ناامیدی اور مایوسی کی زنجیروں کو توڑ کر حق گو، نڈر، بہادر اور سچ بات کہنے کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے۔ اقبال کا فلسفہ خودی ہر دور کے انسان کی زندگی میں حوصلہ اور ہمت کو بڑھا کر کامیابی و کامرانی کی طرف پیش قدمی ہے۔ اس سے قوموں کے وقار، عزتِ نفس، نفسیاتی تربیت، برتری اور اصلاح میں اضافہ ہوتا ہے۔ خودی کے ساز سے عمر جاوداں میں چراغِ جل جاتے ہیں اور خودی سوز سے قوموں کے مستقبل روشن ہوجاتے ہیں۔ اس بارے میں اقبال لکھتے ہیں:

خودی کے ساز میں ہے عمرِ جاوداں کا سُراغ
خودی کے سوز سے روشن ہیں اُمتوں کے چراغ (۱۵)

اقبال کے بنیادی افکار میں تصور اجتہاد کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اکیسویں صدی میں اجتہاد کی بہت اہمیت ہے۔ جدید دور میں بہت سے مسائل ہیں اسلامی تعلیمات میں اجتہاد کے ذریعے قانون اور غورو فکر سے انکار ناگزیر ہے۔ اسلام میں قوانین کا بنیادی مآخذ قرآن ہے اور اس نے ریاست، مذہب، سیاست اور اخلاق کو ایک لڑی میں پرویا ہوا ہے۔ اس میں جمود کی بجائے تغیر، ارتقا اور حرکیات کے نظام کی کارفرمائی ہے۔ اقبال کے نزدیک قرآن کی رہنمائی میں زندگی ایک مسلسل تخلیقی عمل ہے اور مسائل کے حل کے لیے قرآن و سنت لازمی امر ہے۔ اسلامی قانون میں دوسرا اہم مآخذ احادیث رسول ﷺ ہیں۔ مسئلہ اجتہاد میں قانونی احادیث سے مدد لینی چاہیے اور قانون سے ہٹ کر دوسری احادیث سے گریز کیا جائے۔ اجتہاد میں اصول استحسان یا فقہی اصولوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے قانونی غور و فکر، موجودہ حالات و واقعات کا با اختیار مطالعہ کیا جائے۔ احادیث کا مطالعہ باریک بینی سے کیا جائے۔ فقہ کی ازسرنو قرآن اور احادیث سے رہنمائی ضروری ہے۔ ان اصولوں پر کاربند ہونا چاہیے جن پر رسول ﷺ نے احکام قرآنی کی تعبیر فرمائی اور زندگی میں ان کی قدر و قیمت کے لیے واضح اصول قائم کیے۔

حوالہ جات

- ۱۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، علامہ اقبال کا تصور ریاست اور دوسرے مضامین، بزم اقبال، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۱۸-۱۹
- ۲۔ عمر فاروق، شیخ، مرتب، الحکمتہ، جامعہ تدبیر القرآن، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۴۴
- ۳۔ محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال اردو، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۳۰۵
- ۳۔ ایضاً، ص ۶۶۰

- ۵۔ ایضاً، ص ۲۹۰
- ۶۔ ایضاً، ص ۴۰۳
- ۷۔ ایضاً، ص ۴۰۳
- ۸۔ محمد فرمان، پروفیسر، اقبال اور تصوف، بزم اقبال، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۴
- ۹۔ محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال اردو، ص ۳۵۱
- ۱۰۔ ایضاً، ص ۳۸۳
- ۱۱۔ ایضاً، ص ۳۰۵
- ۱۲۔ علی ظہیر منہاس، خودی کی خودانی، مشمولہ، اقبال شناسی اور چراغاں، مرتبہ، ڈاکٹر سید اختر جعفری، بزم اقبال، لاہور، سنہ ندارد، ص ۱۲۹
- ۱۳۔ محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال اردو، ص ۳۷۷
- ۱۳۔ ایضاً، ص ۳۷۶
- ۱۵۔ ایضاً، ص ۳۳۳